الطاف شاہ کے انتقال کا المیہ

افتخار گیلانی

۱۰/اکتوبر ۲۰۲۲ء کی رات جب آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، دہلی سے تہاڑ جیل میں پانچ برسوں سے قید حریت لیڈر اور بزرگ کشمیری رہنما مرحوم سید علی گیلانی کے داماد، الطاف احمد شاہ کے انتقال کی خبر آئی، تو شاید ہی کسی کو اس الم ناک خبر پر حیرت ہوئی ہو۔ قیدیوں کو علاج معالجے کی سہولیات فراہم نہ کرنے کی وجہ سے صرف پچھلے ایک سال میں یہ کسی سیاسی قیدی کی موت کا چھٹا واقعہ ہے۔ جن میں کشمیر سے جماعت اسلامی کے رکن غلام محمد بٹ، تحریک حریت کے صدر محمد اشرف صحرائی کے علاوہ مہاراشٹرا میں ماؤ نواز کمیونسٹوں کی حمایت کے الزام میں قید ۸۳ سالہ پادری سٹن سوامی، ۳۳ سال کے پانڈو ناروتے اور ۳۸ برس کے کنچن نانو وارے شامل ہیں۔ افسوس کہ عدالتیں، پولیس اور تفتیشی ایجنسیوں کے اس استدلال کو تسلیم کرتی ہیں کہ جیلوں میں علاج کی سہولیات موجود ہیں، اس لیے اس بنیاد پر ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ مگر جیل میں کس قدر علاج معالجے کی سہولیات دستیاب ہیں اور وہاں ڈاکٹروں کا رویہ کیسا ہوتا ہے، اس کا میں خود گواہ ہوں۔

تہاڑ، جسے ایک ماڈل جیل کے بطور پیش کیا جاتا ہے، اس کی جیل نمبر تین میں واقعی ایک خوش کن ہسپتال ہے، جس کو ججوں اور معائنے پر آئے افسروں اور بعض اوقات غیر ملکی ٹیموں کو دکھا کر متاثر کیا جاتا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں جب نو روز تک دہلی پولیس کی اسپیشل سیل کے انٹروگیشن بھگتنے کے بعد مجھے تہاڑ جیل منتقل کیا گیا، تو داخلے کے وقت ہی جیل کے ڈاکٹروں کے رویے کا اندازہ ہوگیا تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں باقاعدہ پٹائی ہونے کے بعد، کاغذی کارروائی پورا کرنے کے لیے مجھے جیل آفس سے متصل ڈاکٹر کے سامنے پیش کیا گیا، تو وہ ڈاکٹر بجائے میری حالت دیکھنے کے،

اُلٹا مجھ پر لگائے گئے الزامات دریافت کرنے لگا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ میں آفیشل سکرٹس ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا ہوں، تو اس نے پاکستانی ایجنٹ ہونے کا الزام لگا کر مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر اور اس کے اسسٹنٹ پر لازم ہے کہ نئے قیدیوں کو سیل یا وارڈوں میں بھیجنے سے قبل ان کی طبی جانچ اور اگر وہ زخمی ہوں، تو اس کیفیت کا اندراج کرنا ہوتا ہے۔ میری ناک اور کان سے خون رس رہا تھا۔ جیل کے ڈاکٹر نے ان زخموں کو پولیس اور انٹروگیشن کے کھاتے میں ڈال کر مجھے دستخط کرنے کے لیے کہا۔ میں نے جواب میں کہا کہ ''یہ خاطر مدارات چند لمحے قبل جیل آفس میں ہی ہوئی ہے، اس کا پولیس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے''۔

جیل نمبر تین کے اس ہسپتال میں، جہاں الطاف شاہ کو کئی ماہ تک کینسر کا علاج کرنے کے بجائے بس درد روکنے کی ادویات دے کر واپس سیل میں بھیج دیا جاتا تھا۔ یہاں کی او پی ڈی کا بھی مَیں نے بار بار مشاہدہ کیا تھا۔ اسٹتھ سکوپ لگا کر دیکھنا تو دُور کی بات ہے، ڈاکٹر قیدیوں کو دُور سے انھیں ہاتھ لگائے بغیر علاج تجویز کرتے ہیں۔ بجائے مریض سے اس کی تکلیف کے بارے میں پوچھنے کے، وہ اس کے کیس کے بارے میں تفتیش کر کے، سزائیں بھی تجویز کرتے رہتے ہیں۔ میڈیکل سائنس کی پوری اخلاقیات کا جیل کے ان ڈاکٹروں نے جنازہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ علاج کے نام پر تمام مریضوں کو ایک ہی دوا دیتے تھے، چاہے پیٹ کا درد ہو یا نزلہ، زکام۔ ایک بار ہمارے وارڈ میں ایک قیدی کو شدید نزلہ، زکام لاحق ہو گیا تھا اور دوسرے قیدی کو پیچش ہو گئی تھی۔ دونوں جب ہسپتال سے واپس جیل وارڈ میں آئے تو معلوم ہوا کہ ان کو ایک ہی طرح کی دوا دی گئی ہے۔

تہاڑ میں ایک رات میرے پیٹ میں سخت درد اٹھا کہ برداشت سے باہر ہو گیا اور کئی بار قے ہو گئی۔ جیل میں، رات کی ڈیوٹی پر مامور جیل حکام، بیرکوں اور وارڈوں کو بند کر کے جیل آفس میں جا کر آرام کرتے ہیں۔ میرے ساتھی قیدیوں نے شور مچا کر جیل آفس تک آواز پہنچانے کی کوشش کی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک وارڈن آ گیا اور بیرک کی سلاخوں کے باہر سے ڈانٹ کر پوچھا: ''کیوں شور مچا رہے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''قیدی کی طبیعت خراب ہے''۔ اس نے نام پوچھا۔ گیلانی کا نام سنتے ہی اس نے کہا کہ ''مرنے دو'' اور واپس چلا گیا۔ قیدیوں کو اس پر سخت صدمہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیرک میں موجود پچاس سے زائد قیدیوں نے دوبارہ چیخ پکار بلند کی۔ دراصل کچھ عرصہ قبل

اسی وارڈ میں ایک قیدی کی رات کے وقت موت واقع ہوگئی تھی اور صبح سویرے پورے وارڈ کے قیدیوں کو سخت بُرا بھلا کہا گیا تھا کہ: ''آپ نے جیل حکام کو کیوں آگاہ نہیں کیا؟''۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے ہدایت دی تھی، کہ ''ایسی صورت حال میں گلا پھاڑ کر چیخ پکار بلند کیا کریں، تاکہ آواز جیل کنٹرول روم تک پہنچے''۔ ایک گھنٹے کے بعد دوسرا وارڈن، ڈاکٹر سمیت آ گیا اور بیرک کھول کر مجھے ہسپتال میں داخل کروایا۔ اگلے روز پہلے والے وارڈن نے ہسپتال میں آ کر معذرت کرتے ہوئے کہا: ''میں سمجھ رہا تھا کہ یہ پارلیمنٹ حملہ کیس والا گیلانی (مرحوم عبدالرحمان گیلانی، جو اُن دنوں اسی جیل میں تھے، اور بعد میں بری ہو گئے) ہے۔ اس لیے اس نے دھیان نہیں دیا''۔

پرانے سرینگر شہر کے خانقاہ معلیٰ محلہ میں الطاف شاہ کے والد محمد یوسف شاہ، شیخ محمد عبداللہ کے دست راست اور ایک معروف تاجر تھے۔ سری نگر کے مرکز لال چوک میں 'فنتوش ہوزری' کے نام سے ان کی دکان تھی، جس کی نسبت سے بعدازاں الطاف احمد کو الطاف فنتوش کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جب شیخ عبداللہ ''محاذِ رائے شماری'' کی قیادت کر رہے تھے، تو وہ ان کے ساتھ جیل بھی گئے۔ مذکورہ دکان میں پہلے 'محاذِ رائے شماری' اور پھر 'نیشنل کانفرنس' کے لیڈروں غلام محمد بھدروائی، بشیر احمد کچلو، شیخ نذیر وغیرہ اپنی دوپہر یہیں پر گزارتے۔ الطاف شاہ ایک پختہ کار نیشنل کانفرنس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر زمانہ طالب علمی ہی میں وہ شیخ عبداللہ کے سحر سے اس وقت آزاد ہوگئے، جب نیشنل کانفرنس کے خلاف شہر سرینگر میں ہلکی سی کانا پھوسی بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوا کرتی تھی۔ شیخ عبداللہ کے علاوہ شہر کے چند علاقوں میں میرواعظ خاندان کا طوطی بولتا تھا اور یہ دونوں مل کر کسی تیسری قوت کو شہر میں پیر جمانے نہیں دیتے تھے۔ چونکہ دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے، ان کی ساری اساس غنڈا سیاست پر ہی ٹکی ہوئی تھی اور عدم برداشت ان کے کارکنوں میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

۱۹۷۸ء میں جموں و کشمیر، اسلامی جمعیت طلبہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کی ذمہ داری محمد اشرف صحرائی کو سونپ دی۔ الطاف شاہ کو ۲۱ سال کی عمر میں اس کا پہلا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں جب اس تنظیم کا پہلا اجلاس گول باغ (حال ہائی کورٹ کمپلیکس) میں منعقد ہوا، تو اس میں تقریباً دس ہزار طلبہ نے شرکت کی۔ ۱۹۸۰ء میں اس تنظیم نے شیخ تجمل اسلام کی قیادت میں

ایک اسلامی کانفرنس بلانے کا اعلان کر دیا، جس پر حکومت نے پابندی لگا کر اس کے منتظمین کو حراست میں لے لیا۔ یہ الطاف احمد شاہ کی غالباً پہلی گرفتاری تھی۔ وہ اس وقت کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ تعلیم میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ ان کو پہلے ادھم پور اور پھر ریاستی جیل میں رکھا گیا۔ ۱۹۸۱ء تک جمعیت بیشتر تعلیمی اداروں میں اپنی شاخیں قائم کر چکی تھی۔ اسی دوران جماعت میں یہ خدشہ سر اٹھانے لگا کہ آگے چل کر یہ کہیں ایک متوازی تنظیم نہ بن جائے۔ ایک سال بعد جماعت اسلامی نے اسلامی جمعیت طلبہ کی انفرادی خودمختار حیثیت ختم کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ جب جمعیت نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کیا، تو جماعت نے اس طلبہ تنظیم میں موجود اپنی افرادی قوت کو واپس بلا یا اور ان کو شعبۂ طلبہ کی ذمہ داری دی، ان افراد میں الطاف احمد بھی شامل تھے۔

میں نے پہلی بار ان کو غالباً اکتوبر ۱۹۸۳ء میں دیکھا، جب اسکول کے امتحانات ختم ہو چکے تھے اور سوپور سے اپنے ننھیال سرینگر کے قدیمی علاقے مہاراج گنج آیا ہوا تھا۔ سرینگر سے شائع ہونے والے روزنامہ آفتاب میں الطاف صاحب کے مضامین پڑھتا تھا۔ ان دنوں اسمبلی انتخابات کی مہم زوروں پر تھی۔ شیخ عبداللہ کی وفات کے ایک سال بعد 'نیشنل کانفرنس' یہ انتخابات فاروق عبداللہ کی قیادت میں اور میر واعظ کی پارٹی 'عوامی ایکشن کمیٹی' کے اشتراک کے ساتھ لڑ رہی تھی۔ جماعت اسلامی نے زینہ کدل کی نشست سے الطاف احمد کو کھڑا کیا ہوا تھا، جو شیروں کی کچھار میں پنجہ آزمائی کے مترادف تھا۔ ان دنوں مجھے وہاں گھر کے باہر کچھ شور سنائی دیا۔ ایک نوجوان دروازہ کھٹکھٹا کر لوگوں سے جماعت اسلامی کے نشان ترازو پر ووٹ ڈالنے کی استدعا کر رہا تھا۔ ان سے علیک سلیک تو نہیں ہوئی، مگر میں نے دیکھا کہ گلی میں لوگ اس نوجوان کو گالیاں بک رہے تھے کہ وہ کیسے شیخ عبداللہ کی پارٹی کی مخالفت کی جرأت کر رہا ہے۔ مقامی مسجد کے پاس چند لوگ باتیں کر رہے تھے کہ یوسف شاہ صاحب جیسے شریف آدمی نے کیسی ناخلف اولاد کو جنم دیا ہے اور وہ کیسے اس کو برداشت کر رہے ہیں؟ اس الیکشن میں الطاف صاحب کو بس ۴۶۱ ووٹ ملے تھے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ 'فنتوش ہوزری' کی دکان نیشنل کانفرنس وغیرہ کا گڑھ ہوا کرتی تھی، لیکن جب الطاف احمد نے کاروبار میں اپنے والد صاحب کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو یہ دکان جماعت اسلامی، پیپلز لیگ اور آزادی پسند کشمیری تنظیموں کے لیڈروں کا بھی ٹھکانا بن گئی۔ کمال یہ کہ

یہ دکان دونوں متحارب خیالات کے لیڈروں کے مل بیٹھنے کا میٹنگ پوائنٹ بن گئی۔ الطاف احمد کی جان توڑ کوششوں سے سری نگر شہر شیخ عبداللہ اور ان کی نیشنل کانفرنس کے جادو سے آزاد ہوگیا۔

۱۹۸۶ء میں جب ان کی شادی، محترم سیّد علی گیلانی کی تیسری بیٹی زاہدہ سے طے ہوئی، تو وہ کئی بار جیل کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے اور جماعت اسلامی کے سرگرم ارکان میں شامل تھے۔ اس رشتہ کی وجہ سے اگلے سال ۱۹۸۷ء کے ریاستی الیکشن میں ان کو ٹکٹ نہیں دیا گیا، کیونکہ 'مسلم یونائیٹڈ فرنٹ' (MUF) کا اتحاد جو 'نیشنل کانفرنس-کانگریس اتحاد' کے خلاف بنا تھا، اس نے علی گیلانی صاحب کو پارلیمانی بورڈ اور انتخابی مہم کا سربراہ بنا کر امیدواروں کو منتخب کرنے کا کام سپرد کر دیا تھا۔ اس وقت حکومتی اتحاد کے خلاف ایک زبردست لہر چل رہی تھی۔ فاروق عبداللہ کے کانگریس کے ساتھ اتحاد نے شہر میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ بھارت میں اس امر واقعہ پر اتفاق رائے ہے کہ ان انتخابات میں بے تحاشا دھاندلیوں اور نتائج میں ہیر پھیر کی وجہ سے ہی ۱۹۸۹ء میں عسکری تحریک کا جنم ہوا۔ الطاف احمد شاہ، شہر سرینگر میں انتخابی اسٹریجی کی کمان کر رہے تھے۔ حزب المجاہدین کے سربراہ محمد یوسف شاہ (صلاح الدین) لال چوک حلقے سے انتخابی میدان میں تھے، اور جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) کے سربراہ محمد یاسین ملک ان کے انتخابی ایجنٹ تھے۔

الطاف شاہ سے میری پہلی ملاقات کشمیر ہاؤس دہلی میں ۱۹۹۰ء میں ہوئی، جب میں پڑھائی کے لیے دہلی میں مقیم تھا۔ ہمارے ایک رشتہ دار کشمیر یونی ورسٹی میں پروفیسر وجیہہ احمد علوی امریکا جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھے شام کو کشمیر ہاؤس آنے کے لیے کہا، جہاں وہ ٹھیرے تھے۔ انھی کے کمرے میں الطاف شاہ بھی ٹھیرے تھے، جو دہلی میں سفارتی اور میڈیا اداروں کو کشمیر کی خراب صورتِ حال کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ کشمیر ہاؤس سے باہر کہیں رہایش چاہتے تھے۔ ڈنر کے بعد وہ میرے کمرے میں ہی مقیم ہوئے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے علیحدہ رہایش کا انتظام کرلیا۔ چند ماہ بعد جب وہ عید کے لیے سرینگر جا رہے تھے، تو ایئرپورٹ پر ان کو گرفتار کرکے جموں کے 'جائنٹ انٹروگیشن سینٹر' (JIC) پہنچا دیا گیا۔

انھی دنوں وہاں سیّد علی گیلانی کو بھی پہنچایا گیا تھا۔ ان کے سامنے الطاف شاہ کو پورے آٹھ ماہ تک ایک تاریک قبرنما 'سیل' میں رکھا گیا۔ رُوداد قفس میں سید علی گیلانی لکھتے ہیں:

''یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ نوجوان اس قبر میں کیسے زندہ رہا؟ کسی جاندار شے کو ایک طویل عرصے تک سورج کی روشنی سے محروم رکھا جائے، تو اس کی جان دھیرے دھیرے نکلتی ہے۔ جسم پھول جاتا ہے اور اعضاء پر کائی جم جاتی ہے۔ پھر خود بخود اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ الطاف احمد شاہ صرف اس لیے اس مقتل سے زندہ لوٹ آیا کہ اللہ نے ابھی اس کی زندگی باقی رکھی تھی، ورنہ پروگرام تو یہی نظر آرہا تھا کہ گھٹ گھٹ کر، سڑسڑ کر، ایڑیاں رگڑتے رگڑتے، وہ جان جانِ آفریں کے سپرد کردے''۔

آٹھ ماہ تک اس اندھیری قبر میں رہنے کے بعد ان کو جموں سینٹرل جیل منتقل کیا گیا۔ جب ان کے والد اور بچے ملنے آئے، تو وہ الطاف شاہ کو پہچان ہی نہیں پا رہے تھے۔ ان کا بدن پھول چکا تھا اور آنکھیں بے نور ہوچکی تھیں۔ اس لیے ان کی فیملی نے جموں ہی میں قیام کیا، تاکہ ادویات اور خوراک کی فراہمی سے ان کی بحالی صحت کی کوشش کریں۔ غالباً چار سال اس جیل میں قید رہنے کے بعد ان کو اس زمانے میں رہائی ملی، جب حریت کانفرنس کی تشکیل ہورہی تھی۔

الطاف احمد شاہ اور حسام الدین ایڈووکیٹ دو ایسے اشخاص ہیں، جو سید علی گیلانی کے ساتھ حکمت کار اور منصوبہ ساز کے طور پر کام کرتے تھے۔ یہ دونوں کوئی شعلہ بیان مقرر تو نہیں تھے، مگر پلاننگ اور اسٹرے ٹیجی ترتیب دینا ان کا کمال تھا۔ الطاف شاہ اپنے آپ کو خاصے لو پروفائل میں رکھتے تھے۔ پورا اسپیچ وغیرہ ترتیب دے کر وہ خود پیچھے یا سامعین میں ہی بیٹھ جاتے تھے۔ ۲۰۰۳ء کے بعد جب کچھ کشمیری لیڈروں کو سیاسی ماحول حاصل ہوگیا تھا، تو ان کے مشورے پر سیّد علی گیلانی نے اس کا بھرپور استعمال کرکے عوامی رابطہ مہم شروع کی۔ الطاف شاہ اس گھر گھر مہم کے آرگنائزر تھے۔ جس کے نتیجے میں پونچھ، راجوری اور جموں شہر سے لے کر گریز، اوڑی اور کرنا کے دُور دراز علاقوں تک علی گیلانی نے گھر گھر جا کر لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور مجالس میں تقاریر کیں۔

جب بار ہمولہ میں ان کے میزبان کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا، تو اس کے بعد سیّد علی گیلانی رات کو کسی مسجد میں رکتے تھے۔ اس سے عوامی رابطہ کی اور راہیں نکلتی تھیں، کیونکہ ان کے ساتھ مسجد میں پورا محلہ یا کم وبیش قصبہ کے لوگوں کا ازدحام بیٹھتا تھا۔ ۲۰۰۸ء میں کشمیر کی سیاسی تحریک کو جو جہت ملی، تو یہ عوامی رابطہ مہم، اس کی ایک بڑی بنیاد تھی۔ پھر ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۴ء کی اسٹریٹ ایجی ٹیشن، جس کو کشمیر کا 'انتفادہ' کہا جاتا ہے، وہ اسی مہم کی پیداوار تھی۔ اس مہم

کی کامیابی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔اس بامعنی اُبھار سے بوکھلا کر ۱۵ستمبر ۲۰۰۴ءکو حسام الدین ایڈووکیٹ جیسے دانش وراور محسن کو سرینگر میں ان کے گھر پر نامعلوم بندوق برداروں نے ہلاک کر دیا۔ اس کے دو ماہ بعد ۷ نومبر۲۰۰۴ءکو الطاف احمد شاہ جب افطار کرنے کے بعد نماز مغرب ادا کرنے مسجد کی طرف جارہے تھے،انھیں فائر کر کے شدید زخمی کر دیا گیا۔ان کے ایک پڑوسی ڈاکٹر نے بروقت طبی امداد دے کر خون روکنے کا کام کیا اور پھر سرینگر اور دہلی میں ڈاکٹروں کی اَن تھک محنت اور متعدد آپریشن کروانے کے ایک سال بعد وہ شفایاب ہوگئے۔ان دونوں پر قاتلانہ حملوں کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ لوگ سیّدعلی گیلانی صاحب کے قریب آنے اور کھل کر سرگرمیاں کرنے سے باز رہیں۔ علی گیلانی صاحب نے ۲۰۰۷ء میں اپنی تنظیم 'تحریکِ حریت کشمیر' بنائی تو اس کی تشکیل میں الطاف احمد شاہ نے مرکزی کردار نبھایا اور اسی تنظیم کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔

جب نوے کے عشرے میں بدبختی کے نتیجے میں 'العمر'، 'حزب' اور 'جے کے ایل ایف' کے درمیان تنازعات نے سر اُٹھایا تو یہ الطاف احمد ہی تھے، جنھوں نے اپنے رابطوں سے معاملات کو سلجھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ دراصل ان کے قدرشناس ہرگروپ میں موجود تھے کہ جنھیں بُرے وقتوں میں الطاف صاحب نے مدد اور پناہ مہیا کی تھی۔ دُنیا میں کوئی فرد ایسا نہیں کہ جس سے شکایت پیدا نہ ہو۔ غلام قادر وانی، سیّدعلی گیلانی صاحب کو بہت عزیز تھے۔ پہلے اُن کو اور پھر بعض دیگر احباب کو شکایت ہوئی کہ الطاف شاہ عام لوگوں اور گیلانی صاحب کے درمیان رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ وانی صاحب جب مایوس ہوکر کنارہ کش ہوئے تو کچھ مدت بعد نامعلوم دہشت گردوں نے ۴ نومبر ۱۹۹۸ءکو انھیں بانڈی پورہ میں ہلاک کر دیا۔

لگتا ہے کہ ۱۹۹۰ء میں جے آئی سی اور پھر ۲۰۰۴ء میں نامعلوم بندوق بردار جس مہم میں ناکام ہوئے، 'نیشنل انوسٹی گیشن ایجنسی' (این آئی اے) کے ذمہ داروں، تہاڑ جیل کے افسروں اور جیل ڈاکٹروں نے اس امر کو یقینی بنادیا کہ الطاف احمد شاہ اس دنیا سے کوچ کرجائیں۔ یکم اکتوبر ۲۰۲۱ء کو این آئی اے کی درخواست کے جواب میں رام منوہر لوہیا ہسپتال کی میڈیکل رپورٹ میں درج ہے: ''مریض ایک سے زیادہ اعضاء کی خرابی کے ساتھ شدید بیمار ہے، اس کو زندہ رکھنے کے لیے وینٹی لیٹر اور سپورٹ کی ضرورت ہے۔ مریض کو آنکولوجی سپورٹ اور پی ای ٹی اسکین کی ضرورت ہے جو

ہمارے ہسپتال میں دستیاب نہیں ہیں، اس لیے مریض کو اوپر بیان کردہ مرکز میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے''۔ان کی بیٹی روا شاہ آخری وقت تک ان کے علاج کی اپیل کرتی رہی۔

بی بی سی، لندن سے بات کرتے ہوئے روا شاہ نے بتایا تھا کہ'' ڈاکٹروں نے بتایا کہ اُن کا دل اور گردے بیکار ہو گئے ہیں،اوراب صرف دماغ کام کر رہا ہے۔ ابو نے کچھ کہنے کے لیے کاغذ اور قلم کا اشارہ کیا،لیکن اس کی اجازت نہیں دی گئی''۔جیل کے ڈاکٹر مہینوں تک ان کو پین کلر دے کر واپس سیل میں بھیج دیتے تھے۔ جب ان کی طبیعت بگڑ گئی، تو پہلے 'دین دیال اپادھیائے ہسپتال' میں اور پھر دہلی کے 'رام منوہر لوہیا ہسپتال' میں منتقل کیا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ''کینسر ان کے جسم میں آخری اسٹیج پر پہنچ چکا ہے اور اُن کے اہم اعضا ناکارہ ہو چکے ہیں''۔ روا شاہ اپیلیں کرتی رہیں کہ''میرے والد کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز منتقل کیا جائے، جہاں سرطان کے علاج کے لیے باقاعدہ شعبہ ہے''۔دہلی ہائی کورٹ کے آرڈر پر جب ان کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ منتقل کیا گیا تو اس وقت تک وہ کوما میں چلے گئے تھے۔

واضح رہے تہاڑ جیل میں قید کشمیری رہنماؤں یاسین ملک، شبیر احمد شاہ، آفتاب شاہ عرف شاہد الاسلام اور انجینیر رشید سمیت متعدد کشمیری لیڈروں کو کئی عارضوں کا سامنا ہے۔ یاسین ملک کی اہلیہ اور ہمشیرہ، شبیر احمد شاہ اور آفتاب شاہ کی بیٹیاں بھی آئے روز حکام سے اپیل کرتی رہتی ہیں کہ اُن کے علاج کی خاطر انھیں انسانی بنیادوں پر گھروں میں ہی نظر بند رکھا جائے یا کم از کم ان کا تسلی بخش علاج کرایا جائے۔ الطاف احمد شاہ کی کسمپرسی میں موت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان قیدی لیڈروں کی زندگیوں کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے اور وہ موت کی لکیر پر چل رہے ہیں۔

جو میدان الطاف شاہ نے چنا تھا، اس میں یہ نتیجہ معلوم ہی تھا کہ موت و حیات ہمیشہ باہم دست و گریباں رہے گی۔ اس میدان میں زندگی بہت مہنگی اور موت ارزاں ہوتی ہے۔موت، زندگی سے ایک لمحے کے فاصلے پہ تعاقب میں پھرتی ہے۔ اس میدان میں جمے رہنے کے لیے ایمان، عزم اور ثابت قدمی چاہیے۔ دو بار انھوں نے موت کو چکمہ دیا تھا۔ شاید وہ تیسری بار بھی اس کو شکست دیتے، اگر ان کا خاطر خواہ علاج کرایا جاتا یا تہاڑ جیل کے ڈاکٹر اپنے پیشے کے اصولوں سے انحراف نہیں کرتے___ انا للہ وانا الیہ راجعون۔